# میر تقی میر کی شاعری کا منظر نامہ

پروفیسر شمیم کوثر

Prof. Shamim Kausar

Department of Urdu,

Govt. Girls Degree Colloege, Jinnah Town, Quetta, Balochistan.

***Abstract:***

*Mir is most famous and unique poet. He is king of ghazal. He finds the love and esheqe of reality. Love is a major phenomenon in lierature. It is an important topic of literature. Mir had special longing for this art of expression and play of words. Asnat is such a craft of words which has various types of kinds. Other poets who wanted to be like Mir as they were inspired by his poetry. This short article defines the image and place of Mir in Urdu.*

سرتاج شعرائے ادب میر تقی میر (۱۷۲۳ء۔۱۸۱۰ء) سید زادے کی زندگی میں غم کی گھٹاوں کے پیچھے والدین کا بچھڑنا، سوتیلے بھائیوں کا ناروا سلوک، خاندانی تلخیاں، معاشی بدحالی، مالی مشکلات، ناکامیٔ عشق، ہجرت کا دُکھ اور دِلّی کا اجڑنا، آشوبِ دہر، معاشرتی آشوب یہ وہ ساماں تھے جن کی بدولت ان کی نازک طبع اور درویشانہ طبعیت غم پسندی، اور رنج والم سے ہم کنار ہوئی اور آخری لمحات تک یہ اثرات آنسوؤں کی کہانی پیش کرتے رہے۔ بار بار کی چوٹوں نے انہیں گوشہ نشینی، بے ثباتی اور حزن وملال کا پیکر بنا دیا۔ ان کی زندگی میں تمام عمر خزاں کا راج رہا۔ غم ذات اور غم زیست نے برابر رلائے رکھا۔ دل کی ویرانیاں آنکھوں سے بہتے دریا، رات بھر کا جاگنا ان کا موضوع رہا ہے۔

اُمڈتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

---

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات ہم
اب یہی روزگار ہے اپنا

---

رات گزر رہی ہے مجھے نزع میں روتے روتے
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح ہوتے ہوتے

ان کے ذاتی تجربات کو ہم ان کی شاعری میں بارہا محسوس کرتے ہیں۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں

نے اپنی صلاحیتوں سے غزل کو فنی اعتبار سے پختگی بخشی ہے۔اسی فنی پختگی نے انھیں ایک بڑا شاعر بنایا ہے کہ وہ زندگی کے قریب ہوئے اور اس سے ہم آہنگ ہو کر اپنے اور قاری کے جذبات کو اشعار میں سمو دیا۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خیال میں:

''اس گہرے فنی شعور نے میر کو صحیح معانوں میں میر بنایا ہے۔اس کی بدولت ان کے فن میں زندگی پیدا ہوئی ہے۔زندگی جو صحیح معنوں میں فن کو بلند کرتی ہے۔زندگی اور فن کی اس ہم آہنگی نے انھیں تحریک بنا دیا ہے۔ایک ادارے کی حیثیت دی ہے۔''(۱)

ان کے اشعار مشکل پسندی میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔وہ تہ داری کی بجائے سادگی سے اظہار کرتے ہیں۔ان کے کلام میں گریہ زاری، نمنا کی، حزن و یاس، واردات قلبی، واقعیت، آفاقیت، دکھ والم اور گہری افسردگی ہے۔وہ محبوب کی کج ادائی اور بے رخی کو اپنی وفاداری پر استوار کرتے ہیں۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''میر نے اپنی تخلیقی قوت سے اس دور کے غم والم کو اپنی شاعری میں سمو کر نہ صرف اس کی ترجمانی کی بلکہ تزکیہ (کھتارس) کر کے اس پر فتح بھی حاصل کر لی۔ان کی شاعری غموں کو ہضم کر کے نہ صرف انھیں ایک مُثبت صورت دے دیتی ہے بلکہ انسان کو غم ونشاط کی کیفیت سے بلند تر کر دیتی ہے۔میر کے غم میں ٹھہراو ہے۔ان کی نشتریت ہمارے اندر حیات و کائنات کے لیے رشتوں کا شعور پیدا کر کے ہمیں بیدار کر دیتی ہے۔میر نے غم والم کو زندگی کے تعلق سے دیکھا اور انھیں عام انسانی جذبات میں تلاش کر کے اجتماعی احساس کا حصہ بنا دیا۔میر کی شاعری ہمیں اقبال کی طرح رجائیت کا براہِ راست پیغام نہیں دیتی بلکہ بحیثیت مجموعی اس کا اثر مثبت ہے۔''(۲)

وہ آشوبِ زمانہ اور اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان کے زمانے میں چار سو دکھ کی کیفیت تھی اسی لیے یہ دکھ اور مایوسی ادب میں بھی جھلکتی ہے۔اس دکھ کو کم کرنے میں تصوف نے خوب ساتھ دیا۔تصوف وہ راستہ ہے جو عرفان الٰہی اور عرفان ذات کی طرف رخ موڑتا ہے۔ویسے بھی دلوں کو اطمینان ذکر اللہ سے ملتا ہے۔ان کا عشق ان کی سیرت کا ایک حصہ تھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے میں:

''عشق ان کی شاعری کی تخلیقی روح ہے اور اسی سے ان کی سیرت وشخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔میر کی شاعری اس لیے عشقیہ شاعری ہے جس میں مقامیت بھی ہے اور آفاقیت بھی۔ایسی شاعری اس سے پہلے نہ اردو میں ہوئی اور نہ میر کے بعد۔آنے والے شعراء پر گہرے اثرات کے باوجود اس عشقیہ رنگ کی کوئی پیروی نہ کر سکا۔یہ عشق کثافت بھی ہے اور لطافت بھی اور ان دونوں کے ملنے سے میر کی شاعری کا رنگ وآہنگ پیدا ہوا ہے۔''(۳)

اپنے کمال فن سے باوقار ان کے خیالات میں سچائی کی جھلک، اشعار میں گہرائی سب سے منفرد بات کہ اس کی شاعری کی شاعرانہ عظمت کو شعرا نے مانا شاید ہی کسی کے حصہ میں آئی۔ذوق، سودا کے اشعار ان کی عظمت کو بلندی دیتے ہیں۔میر کی زندگی کے مختلف پہلو جن خصوصیات سے تشکیل پائے ہیں ان میں ان کے گھر کا ماحول جو فقیرانہ و درویشانہ تھا۔باپ متقی و پرہیز گار تھے۔ان اثرات کے ساتھ ساتھ غم کی کیفیات نے انھیں توڑ دیا لیکن وہ ٹوٹ کر بھی اپنے تجربات شاعری میں سموتے

رہے۔حساس دل کا مالک میر اشعار کے آئینے میں اپنی زندگی کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ کتاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان کی زندگی عشق کی ناکامیوں اور مایوسیوں کا منبع ہے وہ اس کی عظمت کو بھی منواتے ہیں اور لفظوں کی زبان سے تصاویر کی مصوری کرتے ہیں۔ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں:

''میر کا مخاطب عوام ہیں:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر گفتگو مجھے عوام سے ہے

انھوں نے شعر کو سخن کا پردہ بنایا جس سے مقصود افشائے حال تھا۔انہوں نے شعر و شاعری کو شعار عاشقاں قرار دے کر اس پردے میں اپنا غم دل کہا۔''(۴)

ان کے اشعار سوز و گداز سے بھرپور ہیں لیکن پڑھنے والے کے جذبات کو متاثر کر کے آہستگی سے پیار کی کیفیت کے ساتھ ہلکی تھپکی دیتے ہیں وہ جلا کر خاکستر نہیں کرتے اسی توازن نے انھیں پہچان عطا کی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''فن کے لیے جذبے کے اظہار کے لیے ایک ایسے توازن کی ضرورت پڑتی ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اوپر اٹھا سکے یہی عمل ارتقاء ہے۔اگر میر کی شاعری یہ عمل نہ کرتی تو ان کے نالے کی شدت غم ،ان کا جلانے والا سوز و گداز ،ان کی خستگی اور قنوطیت ایک مریضانہ ذہنیت اختیار کر لیتی جس میں مثبت کی بجائے منفی طرز فکر کا اظہار ہوتا۔میر اپنی قوت امتیاز، تنقیدی شعور اور تخلیقی قوت میں ایک ایسا توازن پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے شعر میں ہمیں جلاتے نہیں پیار کرتے ہیں۔''(۵)

میر عشق میں ڈوب تو جاتے ہیں لیکن محبت کے ارفع مقام اور انسانیت کی اعلیٰ ظرفی اور معاشرتی روایات کو نہیں بھولتے۔انہیں یاد رہتا ہے کہ'' دل وہ نگر ہے جو پھر آباد نہ ہو سکے گا ،ہم فقیروں سے بے وفائی کیا؟،کوئی تجھ سا بھی کاش تجھے ملے، بے خودی لے گئی کہاں ہم کو''۔ یہاں پر ان کے جذبات کے تناؤ کا ٹھہراؤ اور تحمل کی کیفیت ان کے وصف شاعری کو اونچا کرتی ہے۔ان کے ہاں دور بینی انتہا کو تھی اس لیے وہ شبنمی نگاہ سے حسن کائنات اور عشق کی رنگینیوں کا سماں باندھتے ہیں۔ان کے ہاں تنقیہہ ( کیتھارس ) ملتی ہے۔ان کے ہاں عشق کی دنیا محض تصوراتی نہیں وہ حقیقت میں ایک دنیا رکھتے ہیں جس میں عشق کے آداب بھی قائم ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''میر کی زندگی اور ان کی غزل کا سب سے اہم پہلو عشق ہے لیکن اس عشق کی حیثیت خیالی نہیں ہے۔وہ خود ایک رابطہ ہے اس کا اپنا ایک نظام ہے۔اس کی اپنی ایک دنیا ہے۔اس کا اپنا ایک اخلاق ہے،اس کی اپنی ایک تہذیب ہے اس میں وسعت اور بے باکی کا پتہ چلتا ہے۔اس میں اتنی سادگی نہیں جتنی نظر آتی ہے۔کتنی چیزوں سے اس کا خمیر اٹھتا ہے نجانے کتنے عناصر اس کی تشکیل میں مدد و معاون ہیں۔وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کو اگر دیکھنا ہو تو اس کی حقیقت میر کے اس عشق میں نظر آتی ہے جو ان کے ایک جذباتی ردعمل ہونے کی حیثیت سے بظاہر ان کی انفرادیت کیفیت ہے۔لیکن اس میں اس قدر عمومیت ہے

اور آفاقیت کا رنگ و آہنگ ہے کہ وہ ہر انسان کا ردعمل نظر آتا ہے۔''(۶)

اسی طرح اُسلوبیت کے لحاظ سے میر مختلف ضرور ہیں لیکن کہیں نہ کہیں مطابقت ملتی نظر آتی ہے۔جس طرح میر اور غالب کے ہاں تصوراتی مطابقت یا مفہوم میں ہم آہنگی کی فضا ملتی ہے۔اسلوبیت میں ہم آہنگی ہو بھی جائے لیکن کیفیات کا اظہار اور واردات قلبی الگ کر دیتی ہے اور جب اس کا شعر پڑھا جاتا ہے تو اس کی پہچان مشکل نہیں ہوتی۔ان کا درد، سوز، بول چال کا انداز، جمالیاتی حسن اور ذاتی دکھ والم کی کیفیات اور تجربات صداقت کا خزینہ تو ہیں ساتھ ہی ان کے اسلوب کی شناخت کا ذریعہ بھی ہیں۔بقول خلیل احمد بیگ:

''اردو شعر و ادب میں اسلوبیاتی انتخاب کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔اکثر دو شاعروں کے خیالات میں مطابقت ہوتی ہے لیکن ان کے لسانی اظہار میں فرق پایا جاتا ہے۔یہی فرق دونوں شاعروں کے درمیان اسلوب کا فرق یا اسلوبی امتیاز بن جاتا ہے۔''(۷)

روبینہ شاہین نے پروفیسر نارنگ کی کتاب ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' کے باب ''اسلوبیات میر'' کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے:

''پروفیسر نارنگ نے اسلوبیات میر کے تجزیے سے میر کے بنیادی اسلوبیاتی امتیازات کو نشان زد کیا ہے۔کلام میر میں طویل مصوتے، نحوی واحدے، روایت، سہل ممتنع، نحوی ترتیب ہندی الفاظ کا رس، نغمگی، صوتیات، معنیات اور لفظیات کے خصائص کو بیان کیا۔ان پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ان کے منفرد لہجے کی شناخت کرائی ہے اور کلام میر کی ظاہر و باطنی سطحوں کو کھولا ہے۔''(۸)

میر کے کلام کی ایک خصوصیت جمالیاتی حسن ہے۔ہر آنکھ اور دل جمال کا متلاشی ہے۔ان کا جمالیاتی حسن محبوب، کے زلف و رخسار، گلشن و بہار، صورت سے سیرت تک تصوف اور حکیمانہ مزاج میں در آتا ہے۔

پروفیسر رضی الدین احمد کے خیال میں ''میر نے انسان کی وفا محبت، اپنائیت پر اعتماد کا جو جمالیاتی جہاں تخلیق کیا ہے۔اسے اگر اردو شاعری کا معیار یا معمار کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔میر کی زبان کا صوتیاتی حسن، تکرار الفاظ، خود کلامی ان کی زبان اور ذہن کا صوتیاتی پیکر ہے لیکن ان کے ضمیر کی پاکی طرف کی وسعت اور ظرافت طبع کا سارا سرمایہ اور سہارا انسان کے حسن سیرت کا وہ تجزیہ ہے جس کی بنا پر میر اردو کی جمالیاتی شاعری کا ضمیر ہے۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میر کا فن بے حد وسیع ہے جہاں تفکر، تصوف، عشقی اور خارجی ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''میر کے ہاں عشقیہ کیفیات میں انسانی سطح برقرار رہتی ہے۔عشق کا سارا عمل التجا، پیار، شکوے شکایات، ہجر، ناکامی سب کچھ اس سطح پر ہوتا ہے۔عاشق میر انسان میر کے روپ میں نظر آتا ہے جس کے اضطراب میں تحمل بھی ہے اور انسانی رشتوں کی پاسداری بھی۔''(۹)

ان کے کلام میں مختلف نوع کی صنعتیں (حسن تکرار، تجنیس، تراکیب، تلمیحات، تشبیہ و استعارہ، علامتیں، محاورات)

جابجا ملتی ہیں۔وہ اصنعات کو نئے طرز اور سلیقگی سے برتتے ہیں۔انہوں نے فارسی تراکیب کا استعمال یوں کیا کہ وہ اردو میں جذب ہوکر رہ گئیں۔ان میں سے چند ایک کا انتخاب ہے۔

حروف عطفی: خاروخس، چشم ودل، بحروکان، ہوش وصبر، تاب وتواں، گل وبلبل، دل وداغ، تاب وتاباں، خاک و خشت۔

تراکیب: موسم گل، تہہ بال، بسان حبیب، سنبل چمن، مدت ہجراں، قامت خمیدہ، شعلہ افشانی، نکہت گل، سبزۂ بیگانہ، آتشِ غم، گرمیٔ عشق، عرق فشانی، پارۂ دل، دلِ مضطرب سلوک وداع، غمِ ہجراں۔

محاورات: چشم تر، آنکھیں پھرنا، آنکھ لڑنا، کوچ کرنا، پیچ وتاب کھانا۔

مختلف زبانوں کے الفاظ: تکا، لیک، سل، لاگا، مندے۔

صنعت تکرار:

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ان کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
کیا میں نے رو کر فشار گریباں رگ ابر تھا تار تار گریباں

صنعت مقابلہ:

صبح گزری شام ہونے آئی میر تو نہ چیتا دن نہایت کم رہا
یہ بھی ادا ہے کوئی خورشید نمط پیارے منہ صبح دکھا جانا ،پھر شام چھپا جانا

صنعت تجرید:

سچ بتلاو میر جی صاحب کیا ہے گرمی سبز رنگوں سے اور گھر میں بھونی بھانگ نہیں

صنعت رقطا:

تجھ کو مسجد ہے ، مجھ کو مے خانہ واعظ اپنی اپنی قسمت ہے

صنعت سیاقتہ الاعداد:

ایک دو چشمک ادھر گردش ساغر کہ مدام سر چڑھی رہتی ہے یہ گردش ایام بہت

تشبیہات:

جی سدا ان ابروں میں ہی رہا کی بسر ہم عمر تلواروں کے بیچ
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

کہیں ان کا مزاج اس علم کی روشنی کو تقسیم کرتی ہے جو ان کے درویشانہ صفت والد نے انھیں بخشی۔جس نے مزاج کو قناعت وصوفیانہ پن عطا کیا اور ہستی کا ادراک ہوا۔یہی وجہ ہے کہ تسلیم ورضا قناعت وتوکل بھی خاصا تھا۔''پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں، خورشید میں بھی اسی کا ہی ذرہ ظہور تھا، اس رند کی بھی رات کٹی جو کہ طور تھا۔'' ادراک کے بارے میں چیخاف کا کہنا تھا اور اسی بات کو عابد علی عابد نے بھی دو اشعار کے تجزیے کے ساتھ پیش کیا ہے:

''کہ ادب میں ادراک کی اتنی اہمیت ہے کہ ادیب جس چیز کا بیان کرے وہ حس کے دائرے سے تعلق رکھتی ہو۔قاری کو متاثر کرے کہ وہ اشیاء کو سونگھ سکے، چکھ سکے، دیکھ سکے اور چھو

سکے۔ اسی کسوٹی پر میر کا پہلا شعر کس کر دیکھیے، معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود اس تکلیف اور اضطراب کو محسوس کر رہے ہیں جو اس عمل میں واقع ہوتا ہے جس کا میر نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے شعر میں ایک ایسی عالمگیر حقیقت بیان کی ہے کہ آج تک نہ کوئی اسے جھٹلا سکا نہ کوئی اس انداز میں بیان کر سکا:

پکتا رہا جو پھوڑا سا یوں ساری رات دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا''(۱۰)

میر کا دل غم والم سے بھرا اور سوز و گداز سے لبریز تھا لیکن ان کی زبان میں بے پناہ دل کشی اور زور کلام میں ترنم تھا۔ ان کی شعلہ بیانی سے بڑے بڑے متاثر ہوئے۔ ان کا یہی انداز ہے کہ شاعروں کو کہنا پڑا:

مصحفی۔ اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا — پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے منہ پر
ناسخ۔ شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
غالب۔ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
ریختے کی تمھیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
ذوق۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
داغ۔ میر کا رنگ برتنا نہیں آساں اے داغ — اپنے دیواں سے ذرا دیکھیے دیواں ان کا
حسرت۔ گزرے بہت استاد مگر رنگ اثر میں — بے مثل ہے حسرت سخن میر ابھی تک
سودا۔ سودا تُو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ — ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرح
انشاء۔ اللہ کرے میر کا جنت میں مکاں ہو — مرحوم نے ہر بات ہماری ہی بیاں کی

بقول محمد عامر اقبال ''میر کی داستان درد کی علامت و رموز، اپنے عہد کے جذبات و احساسات کی پوری کیفیت بیان کرتے ہیں۔ میر نے جہاں باغ، گلستان، چمن اور آشیاں کا ذکر کیا ایسے لگتا ہے کہ اشاروں اور کنایوں میں ملک، وطن اور گھر کا ذکر کیا ہے۔''(۱۱)

وہ محض عشق کی ناکامی یا بت بے مہر کی جفائیں اور بے وفائی سے دنیا سے کنارہ کشی نہیں کرتے۔ بے ثباتی کی وجہ اپنی ذات کی پہچان، دنیا کی پہچان اور رب کی پہچان اور ہستی کا ادراک ہے جو حکیمانہ نکتہ انسان کو رغبت دلاتا ہے کہ رب کی تلاش اپنی ہستی میں کرو۔ زندگی کے راستوں پر بے خبری سے چلنے والے دیکھ۔ ''میں بھی کبھو کسی کا سر پر غرور تھا، ان کے آنسو، دل کی گریہ زاری اور آنکھوں میں رات بسر کرنا کسی فلسفۂ حیات کی تلاش میں نہیں۔ یہ یاس و حرماں لطیف خلش اور خاموش حزنی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔

''شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر، خوش ہیں دیوانگیٔ میر پہ سب، رویا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب۔ برصغیر کے ناگفتہ حالات، ملکی وحدت پارہ پارہ، سیاست چور چور، عوام کی عزت کی دھجیاں اڑ رہی تھیں اور میر کو اپنے عہد کے حکمرانوں

کی مطلق العنانی بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی ''چند لچے ہیں مستعار کار۔ دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار''۔ وہ کنایوں میں اپنی ٹوٹتی تہذیبی بساط کی داستان لکھتے ہیں۔ وہ غمگین تو ہے لیکن اس الم کو نئے شعور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ عید کے موقع پر بھی وہ اسی کیفیت میں دوچار رہتے ہیں۔

ہوئی عید سب نے پہنے خوشی و طرب کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بدلتے یہ لباسِ سوگواراں

بقول فتح محمد ملک:

''عاشق باوفا دردمندی اور پرستاری کے جذبات کے ساتھ محبوب کو ظلم و جور سے باز رکھنے کے اشارے کرنے لگا۔ کھُل کر اس لیے نہیں کہتا کہ محبوب کی رسوائی کا خطرہ تھا۔ سوچتا تھا خود غیر کی دُشنام طرازی سے بچ جائے گا اور محبوب ان اشاروں کنایوں کو سمجھ کر اپنا رویہ بدل ڈالے گا۔''(۱۲)

الفاظ کا چناؤ اور روانی میر کے ہاں ایک وصف ہے۔ قاری پہلی ہی نظر میں لفظ کا لطف لیتا ہے۔ ان کے کلام کی خوبی ہم کلام ہونا ہے۔ شعر پڑھ کر اپنی ہی دل کی کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ گوپی چند نارنگ کی ایک تحریر دل چسپ اور اہمیت کی حامل ہے:

''میر کا زمانہ آج سے دو ڈھائی سو برس پہلے کا تھا۔ میر کے اواخر میں چھاپے خانے کی ابتداء ہوگئی تھی لیکن خود میر کا کلیات فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۱ء میں چھپ کر تیار ہوا۔ میر کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا تو گویا خود انھوں نے اپنا کلیات چھپا ہوا نہ دیکھا ہوگا۔ میر اردو غزل میں کہنے سننے کی اور ال روایت کے آخری امین ہیں۔ وہ بار بار اس کا ذکر کرتے ہیں۔ میر کے اشعار میں باتوں کا انداز ہ پایا جاتا ہے۔''(۱۳)

میر دنیائے غزل کا وہ چمکتا ستارا ہے جس کی روشنی کبھی مدھم نہیں ہوئی۔ اس نے غزل کے علاوہ دوسری اصناف کو بھی موضوعِ سخن بنایا اور کامیاب رہے۔ وہ رشتوں کی پاسداری کرتا، آدابِ عشق کو ملحوظ رکھتا نہایت دل جوئی کے ساتھ عاشق میر سے انسان میر تک کا سفر طے کرتا ہے۔ پریشان حال ضرور ہے لیکن یاسیت کا شکار نہیں۔ وہ زندگی کے تضادات اور محسوسات کو گہرائی سے پیش کرتا ہے۔ ان کے ہاں دنیا کی بے ثباتی اور غیر یقینی کی کیفیت نمایاں ہے۔ ان کا طنزیہ لہجہ ان کے مزاج میں بارہا جھلکتا ہے۔ طنز میں شدت گہرے تعلق کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ طنز کرتے ہیں تو ترنم کی فضا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کے ہاں غنائیت، دلکشی اور موسیقیت ان کے کمال فن کا ثبوت ہے۔ ان کے اشعار لاکھوں بحروں میں نئے انداز سے اُبھرتے ہیں۔ انہوں نے ہندی پنگل کو جس طرح غزل میں سمویا۔ ان کی عظمت کا حصہ بنتا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر نے اپنی شاعری میں زبان کی سطح پر ایک اور انقلاب پیدا کیا کہ اشعار کی بنیاد عام بول چال کی زبان پر رکھی۔ زبان کی سند خواص کی زبان سے لیے جانے والے عمل کو ختم کر دیا۔ اردو زبان میں اتنا بڑا انقلاب اور تبدیلی کے حصے میں آئی۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

وہ ہمیشہ مخصوص اور منفرد انداز سے شاعری کرتے رہے۔اس میں ایک جھلک ان کی برتری کا احساس بھی ہے اور تعلیٰ کی حد ہے۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

وہ اپنے دور میں بحیثیت شاعر بلند مقام پا گئے اور آنے والے دور میں بھی اپنے کمالات اور طرز خاص کو منوانے میں کامیاب رہے۔وہ دل سے شعر کہتے اور سننے والے کے دل میں آسانی سے جگہ بنا لیتے۔انہیں شاعری کی آبرو اور غزل کا بادشاہ کہا گیا ہے۔محمد حسین آزاد کے الفاظ ان کی غزل کے مقام کو بلندی عطا کرتے ہیں:

''غرض ہر چند کہ تخلص ان کا میر تھا مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے۔قدر دانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہ سے دیکھا اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑا دیا۔ہندوستان میں یہ بات انھی کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفے کے طور شہر سے شہر لے جاتے تھے۔''(۱۴)

مختصراً یہ کہ میر کی شاعری اردو ادب میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ان کا انداز بول چال، الفاظ کا انتخاب، زبان کی فصاحت و بلاغت، ترتیب و ترکیب، سادگی، سوز و گداز، جدت، تاثیر، سہل، روانی اور حکیمانہ درد بھرا کلام اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اس پر ہزار ہا نازک پردازیاں اور نازک خیالیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سعدی سے زیادہ پڑھا جانے والا کلام آج بھی اپنے دور کی طرح شہرت رکھتا ہے۔

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے
برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی

## حوالہ جات


۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، میر تقی میر، لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ص:۷
۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو، جلد دوم، حصہ اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص:۴۷۱
۳۔ ایضاً، ص:۵۱۷
۴۔ اشرف، اے۔بی، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے شاعر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص:۱۴
۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، محمد تقی میر، ص:۵۷۱
۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، میر تقی میر، ص:۸
۷۔ خلیل احمد بیگ، مغرب کے چند اسلوبیاتی نظریہ ساز، اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کے مباحث، مرتب: قاسم یعقوب، ص:۱۴۲
۸۔ روبینہ شاہین، مضمون: اردو میں اسلوبیات، نظری مباحث، اطلاقی نمونے، ایضاً، ص:۲۱۴
۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، محمد تقی میر، ایضاً، ص:۵۸۳

۱۰۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، ص:۲۷
۱۱۔ عامر اقبال، میر تقی میر کا فکری و فنی مطالعہ پیغام آشنا، اسلام آباد: سفارت خانہ اسلامی جمہوریہ ایران، ۲۰۱۶ء، ص:۱۲۲
۱۲۔ فتح محمد ملک، تعصّبات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص:۱۲۸
۱۳۔ نارنگ، گوپی چند، پروفیسر، ادبی تنقید اور اسلوبیات، ص:۴۴
۱۴۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، ص:۱۲۲

☆.....☆.....☆